R. No. 2186/57 Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت

ٹیلیفون — ۰۹
قیمت تین روپے سالانہ
فی پرچہ ... نئے پیسے

جلد ۲۵ شمارہ ۱۵ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ اپریل ۱۹۶۶ء

اداریہ

ہمیں ہر چیز سے مطلب ہے

یادش بخیر لکھنؤ کے کافی ہاؤس میں ایک اردو کے ادیب، اردو کے ایک شاعر سے کہہ رہے تھے:

"کیا سنا ہے یش پال ہندی کے چوٹی کے افسانہ نگاروں میں سے ہیں؟"

دوسرے نے کہا۔ "مگر ہمیں سے مطلب!"

آج صرف اردو والوں کا ہی نہیں، سبھی زبانوں کے جاننے والوں کا یہی حال ہے۔ سب اپنے اپنے حلقے میں مست ہیں یا ماتم گسار۔ دوسرے سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔

اس بے نیازی اور بے پروائی سے سبھی کا نقصان ہوتا ہے۔ اردو کے ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں کا فرض ہے کہ وہ ہندی ادب کی رفتار پر بھی نظر رکھیں۔ ہندی میں شاعری کس طرح کی ہو رہی ہے، افسانے کیسے لکھے جا رہے ہیں، نثر کی ترقی کی رفتار کیا ہے، تنقید میں کن پہلوؤں پر خاص توجہ ہے۔ اسی طرح ہندی کے لکھنے والوں کو اردو، بنگالی، تامل اور دوسری زبانوں میں ادب کی رفتار پر نظر رکھنا چاہیے۔ اس سے نہ صرف ہم ایک زبان کے جاننے والوں کو دوسری زبان کے جاننے والوں سے قریب کر سکیں گے، ایک زبان کے اچھے اور معنی خیز تجربوں اور کارناموں سے فائدہ بھی اٹھا سکیں گے اور پھر سب کو ہندوستانی ادب میں اور اس کے ذریعے سے ہندوستانی تہذیب میں ایک حیرت انگیز وحدت کا احساس ہوگا۔

اس کے ساتھ ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے۔ اگر آپ اپنی زبان کے حقوق منوانے کے لیے جد و جہد کرتے ہیں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ تو آپ کا فرض ہے اور اس فرض کے ادا کرنے پر آپ اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکتے ہیں مگر اس پر شیخی مارنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ضروری یہ ہے کہ آپ ہر زبان کے حقوق کو منوانے میں مدد دیں۔ ہندی کے ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اردو کے حقوق کو منوائیں اور بنگالی اور تامل کے بولنے والوں کی بھی سنیں۔ اردو کے ادیبوں کا فرض ہے کہ جہاں وہ کسی ہندوستانی زبان کے ساتھ زیادتی دیکھیں، اس پر احتجاج کریں۔ جب کسی قومی زبان کی ترقی میں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں تو نقصان صرف اس زبان کے جاننے والوں کا نہیں، پوری قوم کا ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کسی زبان میں کوئی ادبی شاہکار وجود میں آتا ہے تو سبھی زبانوں کے ادب پر اس کا اثر پڑ سکتا ہے اور پڑنا چاہیے۔

دوسری زبانوں کے علاوہ ہمیں دوسرے کاموں سے بھی سروکار رکھنا ہے۔ سائنس کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ فنون لطیفہ کی ترقی کی رفتار کیسی ہے۔ سیاست کدھر جا رہی ہے۔ اقتصادی حالات کیا ہیں۔ جمہوریت کے ساتھ جمہوریت کے ماننے والے کیا سلوک کر رہے ہیں۔ منصوبہ بندی کیوں اپنے مقاصد میں کوئی نمایاں کامیابی نہیں حاصل کر رہی ہے۔ کھیتوں سے بھوک کیوں اگ رہی ہے۔ لوگ ذرا ذرا سی بات پر بسیں، ریل کے ڈبے، ڈاک خانے کیوں جلانے لگتے ہیں۔ طلبہ کیوں بے راہ ہو رہے ہیں۔ تعلیم کا معیار کیوں گر رہا ہے۔ آج ہر وہ شخص جو آنکھیں کھلی رکھتا ہے اور جس کے پاس ضمیر کے نام کی کوئی چیز ہے کیوں دل شکستہ اور مرجھایا ہوا ہے۔

گویا ہمارا ذہنی افق جتنا وسیع ہوگا، ذات میں اسی قدر امکانات

اس شمارے میں

باجود دیکھیں گے، اتنا ہی ہم پر واضح ہوگا کہ وہ اردو کا مسئلہ ہو یا گراں کا منصوبہ بندی کی کامیابی کا سوال ہو یا آزادی کو روکنے کا ہمیں ایک قومی اور جمہوری اور مہذب نقطۂ نظر پیدا کرنا ہوگا حقوق سے پہلے فرائض کو سمجھنا ہوگا چیزوں کو مناسب پس منظر میں دیکھنا ہوگا۔ اردو کی ترقی کے لیے اسے زیادہ ہندوستانی ہونا اور ہندوستانی ہونے کے لیے اسے عالمی ہونا پڑے گا۔ ادب کی ترقی کے لیے سائنس کے جدید ترین انکشافات کا علم حاصل کرنا پڑے گا۔ مشرقی علوم کو سمجھنے کے لیے مغرب سے بھی کچھ سیکھنا لینے ہوں گے اور مغربی معیاروں کے علم کے ساتھ مشرق کی روح کو بھی ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ پھر ہمیں بیش پال سے بھی مطلب رکھنا پڑے گا اور اس پر اصرار بھی کرنا پڑے گا کہ جدید ذہن کو سمجھنے کے لیے فیض و فراق، ملا و جیدی کا مطالعہ ہر زبان کے ادیب کو کرنا چاہیے۔ کبھی اپنے کو سمجھنے کے لیے دوسرے کی نظر بھی مانگنی پڑتی ہے اور دوسرے کے دل میں جھانکنے سے اپنا درد و کرب اور سوز و گداز بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی علمی و ادبی خدمات کی قدردانی

حکومت اتر پردیش کے اردو کتابوں پر انعامات

لکھنؤ ۳۰ر مارچ۔ اردو کے مشہور انشاء پرداز اور متعدد معیاری اردو کتابوں کے مصنف مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر صدق جدید کو حکومت اتر پردیش کے محکمۂ تعلیم کی پرسکار یوجنا کمیٹی نے ۵ ہزار روپے کا انعام دینے کا اعلان کیا۔

یہ انعام مولانا عبدالماجد دریابادی کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا گیا ہے۔

پانچ پانچ ہزار کے دو انعامات ہندی کے ڈاکٹر نگیندر اور سنسکرت کے ڈاکٹر رائے گوند چندر کو بھی دیئے گئے ہیں۔ اردو کے دوسرے انعامات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

انعام کی رقم	مصنف	تصنیف
۱۵۰۰	ڈاکٹر محمد حسن	دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر
۱۲۰۰	مسکین اکبرآبادی	نقد اقبال
۸۰۰	شمیم کرہانی	عکس گل
۵۰۰	اکبر حیدری	میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر
۵۰۰	نثار احمد فاروقی	دید و دریافت
۵۰۰	پریم پال	سرشار ایک مطالعہ
۵۰۰	سید اقبال احمد	تاریخ شیراز ہند جونپور
۵۰۰	دلاور فگار	شامت اعمال

ڈاکٹر غلام عمر خاں کو حکومت آندھرا پردیش کا انعام

حکومت آندھرا پردیش نے ڈاکٹر غلام عمر خاں، استاد شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی مرتبہ کتاب "مینا ستونتی" کو ۱۹۶۵ء کی منتخب کتاب کی حیثیت سے انعام دیا ہے۔ "مینا ستونتی" ملک الشعراء غواصی کی مشہور مثنوی ہے جس کا قصہ ہندوستان قدیم کی ایک مقبول لوک گاتھا "لورک چندا" کے قصے پر مبنی ہے۔ "مینا ستونتی" شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہونے والے تحقیقاتی مجلہ "قدیم اردو" میں شامل ہے، اور علیحدہ کتابی صورت میں بھی مل سکتی ہے۔ (ایک نامہ نگار)

نریش کمار شاد کو انعام

حکومت پنجاب کی طرف سے اردو، ہندی اور پنجابی زبان کی بہترین کتابوں پر ہر سال جو انعامات دیئے جاتے ہیں اس میں اس سال اردو کا انعام ممتاز شاعر نریش کمار شاد کو ان کی کتاب "میرا کلام" پر دیا گیا ہے۔ اردو شاعری میں اس انعام کے لیے نریش کمار شاد اور کندن کو منتخب کیا گیا ہے۔ کندن کی کتاب "بگولہ" ہے۔ ان دونوں شعراء کو پانچ پانچ سو روپے کا انعام دیا جائے گا۔ (حیات)

حیدرآباد کی ممتاز شاعرہ بانو طاہرہ سعید کا اعزاز

حیدرآباد ۱۹ر مارچ کو اردو کی ممتاز شاعرہ و ادیبہ محترمہ بانو طاہرہ سعید کو ریاستی حکومت آندھرا پردیش کی طرف سے محکمۂ وزارت تہذیبی امور نے شعر و ادب کا اعزاز "مستحق انعام" عطا کیا۔ جناب ابا راؤ وزیر کلچرل امور نے محترمہ طاہرہ کو کیسۂ زر اور شال پیش کی۔ کلا بھون ساہتیہ اکیڈمی کی خوب صورت عمارت میں یہ شاندار تقریب منعقد ہوئی۔ ایڈ ماؤ بھوشن نواب مہدی نواز جنگ سابق گورنر گجرات نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے طاہرہ سعید کی شعری اور ادبی صلاحیتوں کی ستائش کی۔

بانو طاہرہ سعید کے دو شعری مجموعے "ہدیۂ طاہرہ" اور "برگ ناسترن" شائع ہو کر قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ریاستی وزارت کلچرل امور کی طرف سے ایسا ہی اعزاز اس سے پہلے ملک کے ممتاز ترقی پسند شاعر جناب مخدوم محی الدین کو مل چکا ہے۔ (انجمن)

مصحفی کے کلام کی اشاعت

دنیائے ادب میں یہ کمی شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی تھی کہ مصحفی جیسے استاد اور عظیم شاعر کا کلام گوشۂ گمنامی میں پڑا ہے اور کسی کو یہ توفیق نہیں کہ اسے یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کرے۔ مجلس اشاعت ادب نے مصحفی کے چھ دیوان کو شائع کر کے دنیائے ادب کی بہت بڑی کمی پوری کی ہے۔

مصحفی کا کلام جو نامکمل قلمی نسخوں کی شکل میں ہندوپاک کی مختلف لائبریریوں میں بکھرا ہوا تھا۔ "مجلس اشاعت ادب" کی کوششوں سے پہلی بار منظر عام پر آیا ہے۔

(سکریٹری مجلس اشاعت ادب دہلی)

ڈاکٹر وحید اختر

نیا عہد نامہ

(ایک تاثر)

تقریباً دس سال پہلے کی بات ہے۔ ستمبر کا مہینہ، برسات کی گرمی کا حبس اور گھٹن، میں ایک مہینے کی طویل مسافرت کے بعد پہلی بار علی گڑھ آیا تھا اور خلیل صاحب کا مہمان تھا۔ گرمی کے اس بے سفر کے بعد ان کے گھر کی پرسکون فضا میں مجھے ایک عجیب آسودگی اور ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ یہی احساس اس وقت بھی ہوا جب میں نے ان کی تازہ غزلیں اور نظمیں سنیں۔ یہ زمانہ وہ تھا جب خلیل صاحب کی شاعری نیا جنم لے رہی تھی، ان کا پہلا مجموعہ "کاغذی پیرہن" شائع ہو چکا تھا۔ میں ان کی شاعری سے پہلے بھی متعارف تھا مگر ان کی شاعری اور ذات سے میرا براہ راست شخصی تعارف بالکل نیا تھا۔ کاغذی پیرہن کی بیشتر شاعری اور وہ شاعری جسے انھوں نے اپنے پہلے مجموعے سے خارج کر دیا تھا اس زمانے کی ترقی پسندی کے زیر اثر خارجی مسائل کی براہ راست شاعری تھی، اس شاعری میں شاعر کی اپنی آواز نعروں کے شور میں کھو گئی تھی لیکن اس وقت بھی وہ اپنی آواز کو نعروں اور چیخوں کے ہجوم میں بچانے، ڈھونڈنے اور پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور اپنی آواز کی دریافت کے اس عمل نے ہی ان کی شاعری کو نیا جنم دیا تھا۔

"نیا عہد نامہ" جو اس نئے جنم کے دس سال بعد شائع ہوا ہے، شاعری میں فرد کی آواز کی تلاش کا سفرنامہ ہے۔ یہ سفر زیادہ تر شاعر نے اپنی ذات کے اندر اور اپنی روح کی بھول بھلیاں میں کیا ہے۔ اس سفر میں اس کا زادِ راہ تھا شاعر کا داخلی احساس اور اس احساس پر خارجی حقائق کے چھوڑے ہوئے زخم۔ وہ اس سفر سے خالی ہاتھ نہیں لوٹے، انھوں نے اپنی آواز کا بھی کھوج لگایا۔ اپنے مزاج کو بھی پہچانا اور کائنات سے ذات کے مثبت رشتے کی بنیاد بھی ڈھونڈ لی۔

دس بارہ سال قبل یہی کوشش شاعری میں بدعت سمجھی جاتی تھی، جماعتی اور سیاسی شعور کے زمانے میں غم ذات کا ذکر بھی شجر ممنوع کی حیثیت رکھتا تھا۔ نیا عہد نامہ کے شاعر نے اس گرفت سے اس وقت اپنے کو آزاد کرنے کی کوشش کی جب اکثر شاعر اس گرفت کو ہی اپنی ادبی زندگی کا سب سے بڑا سہارا سمجھتے تھے۔ یہ اس جراتِ فکر کا ثبوت ہے جس کا اظہار خلیل الرحمن اعظمی نے تنقید اور شاعری دونوں کے محاذ پر کیا۔ تنقید میں انھوں نے بڑھتی ہوئی تنگ نظری اور گروہ بندی پر حملہ کیا اور شاعری میں داخلیت اور خود کلامی کے انداز کی شاعری کے دفاع میں سرگرمی دکھائی۔ انھوں نے جدید تجربوں کو، خواہ وہ فارم کے ہوں یا اندازِ بیان کے، خوش قبول کیا، اور دوسرے کے یہاں بھی انہیں سراہا۔ اس دور میں "نئی نسل" کے شاعروں کو متعارف کرانے والے نقاد کی حیثیت سے بھی کافی مشہور ہوئے، اس نسل کے کئی شاعر ایسے ہیں جن کو منوانے میں خلیل صاحب کا ہاتھ رہا ہے۔ اس لئے میں انھوں نے فطری طور پر ان کی طرف زیادہ توجہ کی جو ستاعی یا جذباتی لحاظ سے اُن سے قریب تر تھے لیکن مجموعی طور پر انھوں نے اپنے معاصرین کے اعتراف میں کافی کشادہ دلی اور وسیع النظری سے کام لیا۔ یہ بات جو بظاہر معمولی نظر آتی ہے۔ اُس وقت اور اہم ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر تمام ادیب، اور خاص طور پر شاعر اپنے معاصرین کی تعریف میں تنگ دل ثابت ہوتے ہیں، دوسروں پر تنقید کرنے یا تنقید کروانے میں تو شاعر سرگرم رہتے ہیں لیکن اس سرگرمی کا اظہار کھلے دل سے تعریف اور اعترافِ فن میں بہت کم ہوتا ہے۔ خلیل صاحب نے جہاں اُن لوگوں پر سخت تنقید کی، جن سے وہ نظریاتی اختلاف رکھتے تھے، وہیں انھوں نے ان کی کھل کر تعریف بھی کی جنھیں ادبی نقطۂ نظر میں اپنا ہم نوا پایا۔ اس کشادہ دلی نے اُن کی شاعری میں بھی ایک خوشگوار کیفیت پیدا کی۔ اس لیے ان کی شاعری "غم ذات" کی شاعری ہونے کے باوجود ایسی محدود ذات کا اظہار نہیں جو اپنے آپ میں گم، اپنے انا کے خول میں بند، اور اپنے حصار میں محصور ہو۔ یہ غم ذات، غم زمانہ بھی بن گیا ہے اور کہیں کہیں کائنات سے فرد اور ذات کے مثبت اور صحت مند رشتے کا عرفان بھی نظر آتا ہے۔ چند برس پہلے غم ذات کی بات معیوب سمجھی جاتی تھی لیکن اب باشعور ادیبوں اور شاعروں میں یہ احساس عام ہوتا جا رہا ہے کہ حیات و کائنات کے مسائل تک پہونچنے کے لیے ذات کا عرفان بھی ایک ضروری زینہ ہے۔ ہمارے دور میں جبکہ اقدار بحران سے گزر رہی ہیں اور خارجی حقیقت تیزی سے ہر آن تغیر پذیر ہے، ایک ساکن نقطہ جس پر چاروں طرف سے پڑنے والی روشنیاں آ کر مرتکز ہو گئے ہوں، خاص توجہ طلب چیز ہے۔ میرے خیال میں یہ نقطہ جہاں معاشرے کا ہر عکس روشن ہو جاتا ہے، شاعر کی اپنی ذات ہے۔ اسی کے توسط سے وہ صحیح طور پر خارجی مسائل کی آگاہی حاصل کرتا ہے جب اقدار ہی نہیں بلکہ زندگی کی حرمت بھی معرض خطر میں ہو اپنے نفس سے تخاطب فطری چیز ہے۔ یہ حالات سے فرار نہیں بلکہ حالات کو اپنے خوابوں میں ڈھالنے کی کوشش کا نقطۂ آغاز ہے۔ خلیل کی شاعری میں یہ نقطۂ آغاز اپنے امکانات کی پوری وضاحت کے ساتھ روشن ہو گیا ہے۔

نیا عہد نامہ کی شاعری ہیئت کے تجربے کی شاعری نہیں، ذات کے تجربے کے اظہار کی شاعری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے اپنے کچھ حدود ہیں، اور یہ حدود شاعر نے کچھ شعوری اور کچھ غیر شعوری طور پر خود اپنے اوپر عاید کیے ہیں۔ ہر شاعر کے تجربات اور تجربات کے اظہار کے کچھ حدود ہوتے ہیں۔ یہ حدیں اسی وقت ٹوٹتی ہیں جب شاعر نئے تجربوں سے گزرنے اور خود شاعری میں نئے تجربے کرنے کے لیے آمادہ رہے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری نئی شاعری ہیئت اور اظہارِ بیان کے نئے طریقوں کی شاعری بن گئی ہے،

اس نئے پن کی افراط میں اکثر شاعری بھی کھو کر رہ جاتی ہے۔ زندگی کی تیز رفتار تبدیلیوں کا ذہنوں پر یہ اثر پڑا ہے کہ لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ادب میں بھی رجحانات کا اتنی ہی تیزی سے روز روز بدلنا ضروری ہے۔ ادب کی اس مصنوعی اور سطحی تیز رفتاری کا نتیجہ ہے کہ جو شاعر آج سے دس پندرہ برس قبل جدید سمجھے جاتے تھے کبھی کبھی جدید تر تجربوں کے سامنے "متقدمین" میں شامل کر دئے جاتے ہیں، حالانکہ یہی وہ شاعر ہیں جنھوں نے جدید ذہن کو دریافت کیا ہے اور صحیح معنوں میں اپنی آواز اور انفرادیت کو ڈھونڈا اور جانا ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی کا تعلق شاعروں کے اسی گروہ سے ہے جس کی تربیت ترقی پسند مصنفین کے زیر سایہ ہوئی، مگر بعد میں جس نے تنگ نظری اور بندھے ٹکے فارمولوں سے بغاوت کر کے آزادانہ طور پر اپنا راستہ پانے کی کوشش کی۔ یہ بغاوت خود بھی انتہا پسندی کا شکار رہی ہوگی لیکن بہر حال اس نے شاعری کی نئی سمت کے متعین کرنے میں ایک مثبت کام ضرور انجام دیا۔ "نیا عہد نامہ" میں اس بغاوت اور انحراف کے کئی موڑ بہت واضح نظر آتے ہیں، جو موڑ مبہم تھے اور جو نشانات واضح نہ تھے اُن کی تفصیل اس کتاب کے دیباچہ میں مل جاتی ہے۔ اس اختلاف اور انحراف کی تفصیلات پر دیباچے میں کئی جگہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ میں اس تجربے اور ذہنی کشمکش کو اچھی طرح سمجھتا ہوں جس سے آج سے دس برس پہلے ذہن گزرے کیونکہ میں خود بھی اس راہ کی سختیوں سے گزر چکا ہوں۔ یہ اختلاف نظریات کا بنیادی اختلاف نہ تھا بلکہ ادب پر نظریے کے اطلاق کے سلسلے میں بعض اہم غلطیوں اور خامیوں سے انحراف تھا۔ ترقی پسند ادب اور شاعری پر اعتراض کرنے یا اس کی خامیوں کی نشان دہی کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ایسا کرنے والا زندگی اور سماج کے ترقی پسند نظریات سے منحرف اور تائب ہو چکا ہے۔ بد قسمتی سے نئے دور کے اکثر شعرا منفی معنوں ہی میں باغی سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن یہ انحراف شاعروں کی ادعائیت کے خلاف معتزلہ کی عقلیت پسندی کے اعتزال سے مشابہ ہے۔ زندگی اور ادب کے بنیادی تصورات کو قبول کرتے ہوئے اس اعتزال کو مثبت سمت میں ترقی کا اگلا قدم کہا جا سکتا ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی۔ اپنے ہم عصر دوسرے شعرا کی طرح ترقی پسندی کی روایات کے ورثے دار بھی ہیں اور اس کے نقاد بھی۔ ان کی یہ تنقید جو نظموں میں شعر کا قالب اختیار کر لیتی ہے کسی مخالف کی تنقید نہیں بلکہ ایسے شخص کی تنقید ہے جو اپنے ذہنی سفر میں ان اقدار اور اصولوں کو عزیز رکھتا رہا ہے جو زندگی اور ادب میں وسیع تر معنوں میں ترقی پسندی کا لازمہ ہیں۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ دیباچے میں کہیں کہیں اس اختلاف اور تنقید کی لے ذرا زیادہ تیز اور اونچی ہو گئی ہے۔ جس کی اب ویسی ضرورت نہیں رہی جیسی چند برس قبل تھی۔ ادب میں اب یہ مرحلہ اعتدال پا چکا ہے۔ نہ بحثے کے نعروں کی گرمی رہ گئی ہے نہ جدید ذہن کی طرف پہلے سی سرد مہری باقی ہے۔ اب اکثر ایماندار اور باشعور ناقد اور قاری اپنے ذہنوں کو جدید تجربوں اور رد عمل سے ہم آہنگ پا رہے ہیں۔ یہ ایک نیک فال ہے۔ جدید شاعری نئی ہوتے ہوئے بھی ترقی پسند شاعری ہی کے ورثے کی توسیع اور بطور خاص جدید نظم کے اُن امکانات کی ترقی ہے جسے پہلے پہل اس تحریک نے روشن کیا تھا۔ خلیل الرحمن اعظمی کی شاعری میں بھی روایت کی یہ توسیع اور نظم کے امکانات کی یہ ترقی بہت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں وہ منفی میلانات نہ ابھرنے کے برابر ہیں جو شاعری کو ابلاغ کی بھول بھلیاں بنا دیتے ہیں۔ باوجود اپنی داخلیت اور اشاریت کے یہ شاعری واضح ہے۔ اس میں قدروں کا عرفان بھی ہے، موجودہ معاشرتی ڈھانچے سے بے اطمینانی بھی اور بہت مدھم سہی لیکن مستقبل کی روشنی بھی شامل ہے۔ شاعری صرف Abnormal ذہنوں اور رویوں ہی کی پیداوار نہیں ہوتی۔ اس کے لیے ایک حد تک نارمل زندگی گزارنا اور دنیا سے نارمل تعلقات رکھنا بھی ضروری ہے۔ کاغذی پیرہن سے نیا عہد نامہ تک کا ذہنی سفر اسی خوشگوار تبدیلی کی نشاندہی کرتا ہے۔ اسی طرح اس مجموعے کی شاعری میں گھر، گھر کی معصوم خوشیاں، الجھنیں، دکھ اور مسائل بھی ملتے ہیں، اور فکر کی یک رنگی سے اکتاہٹ کا احساس بھی۔ اس فضا نے اعظمی کی شاعری کی انفرادیت کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری غم ذات برتتے ہوئے بھی دوسرے افراد سے نارمل رشتوں کی شاعری بن گئی ہے۔ اس مجموعہ کی بعض نظموں میں جو تلخی اور ناہمواری ہے اس کا سبب بھی بڑی حد تک معاشرے میں ان نارمل رشتوں کو ڈھونڈنے اور پھر انھیں نہ پانے کا نتیجہ ہے۔ اس طرح یہ تلخی، غصہ، جھنجھلاہٹ اور بیزاری بھی ایک شمشیر دو دم کا اظہار بن گئی ہے۔ آج کی شاعری میں اس بات کا امکان ہے کہ بعض پرانی اصناف کو جدید تقاضوں کے لیے استعمال کیا جائے۔ ہجو سماجی طنز کے لیے ایک تیز اور کامیاب ہتھیار کا کام دے سکتی ہے، اور خلیل نے ہجو سے یہی کام لیا بھی ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ طنز کے اس ہتھیار کو زیادہ وسیع اور بڑے مسائل کے لیے آزمایا جائے۔ اگر یہ تجربہ کامیاب ہو تو اردو شاعری میں طنز کی کمی اور طنزیہ شاعری میں گہرائی اور بصیرت کی کم یابی کو دور کیا جا سکتا ہے۔

خلیل الرحمن اعظمی کی شاعری کے سلسلے میں یہ احساس عام ہے اور خود انھوں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے کہ اُن کے لہجے پر میر کی چھاپ ہے۔ لیکن یہ چھاپ محض انداز بیان کی نقالی نہیں بلکہ میر کے لہجے کی گہرائی اور گیرائی تک پہونچنے کا نتیجہ ہے۔ میر کے لہجے کی تقلید کی رسم بھی تو جیسا اکثر ایسی صورتوں میں ہوتا ہے شاعروں نے صرف وہ فضا مصنوعی طور پر پیدا کر لینا ہی کافی سمجھا جو میر کے غم و درد سے پیدا ہوئی تھی۔ خلیل الرحمن اعظمی کے یہاں نہ یہ فضا مصنوعی ہے نہ لہجہ مانگے کا بلکہ انھوں نے اس آواز کو پہلے اپنی روح کی گہرائی میں سنا ہے تب کہیں دوسروں تک پہونچایا ہے۔ اردو کی کلاسکی

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

روشنی کا سفیر

منوّر سامانی

مادرِ ہند نے جو تھا فخرِ بھارت کو
جس کی آواز نے ہر گام وطن والوں کو
آج وہ لال بہادر بھی ہمیں چھوڑ گیا
جس کی گفتار میں نرمی تھی رواداری تھی
اپنے دشمن کو جو تھا دوست بنانے والا
جنگ سے اس کو حقیقت میں بڑی نفرت تھی
باہمی بغض و عداوت کو مٹانے دل سے
عالمِ جنگ کے شعلوں پہ چھڑک کے شبنم
ایک کسی کا نہ سہاگ اجڑے مری دھرتی پر
اپنے بھائی کی جدائی کے تصور میں بیاں
امن کا وہ پیمبر تھا اجالوں کا سفیر
دوستو اس کی حفاظت ہے ہمارے ذمے فرض
پیٹ کی آگ بہر حال بجھانے کے لیے
مفلسی اپنا قدم پھر نہ جمانے پائے

اپنی آغوشِ محبت سے خفا تجھ سا تھا
اک نیا جوش نیا عزم سفر بخشا تھا
کون اب دیش میں ہے گاندھی نہرو کی طرح
جو مہکتا رہا گلزار میں خوشبو کی طرح
دے گیا شمعِ یقیں میرے خیالوں کے لیے
وہ اندھیروں سے لڑا صرف اجالوں کے لیے
دائمی امن و محبت کی بقا کی خاطر
امن کے دیش گیا نور و ضیا کی خاطر
مانگ اب کوئی نہ سیندور سے محروم رہے
اب حسین کوئی نہ افسردہ و مغموم رہے
اس نے مر کر جو جلایا ہے تدبر کا چراغ
آؤ ہم بجھنے نہ دیں لال بہادر کا چراغ
گندم و جو ابھی کھیتوں میں اگانا ہے ہمیں
اپنی طاقت کو اب اس سمت لگانا ہے ہمیں

اندیشہ

رئیس مینائی

عمر سے وجود کے
اوراق کو
کسی اک دن
اکیلے پن کی
دیمک —!
نہ چاٹ جائے کہیں

عزم

(سانیٹ)

محمود رضوی

کسی صورت نہیں جب تشنگی ہائے غمِ پنہاں
نہیں ممکن ہی جب تجھ سے مداوائے غمِ پنہاں
تجھے معلوم تو ہوگا کہ اس شہرِ نگاراں میں
مجھے معلوم ہے شاید کہ اس دشتِ غزالاں میں
بیابانِ طلب میں بھی پئے خیرہ سر ہوں گے ہم
بجائے گنج میں یونہی تہی ساغر رہیں گے ہم
تڑپ بے چارہ رہیں جلد اس رنگیں محفل سے

بظاہر یہ وفا کوشی بھی لے رنگ جبیں کیوں ہے؟
تو پھر یہ پرسشِ حالِ دلِ اندوہگیں کیوں ہے؟
بہاریں سوز و درد بھی کس طرح بدنام ہیں اب تک
بہ ایں دام خداوندِ جنوں رندِ ناکام ہیں اب
زمانہ خوگرِ صہبائے نشاط و کامرانی ہے
ہر اک چہرہ وہ رنگ پرور جامِ جوانی ہے
کہیں اب دور چھیڑوں گا ترانے بربطِ دل کے

امریکہ میں اردو

لکھنؤ ۲۰ / مارچ: "امریکا میں اردو" کی کہانی ایک مہم کے آغاز کی کہانی ہے، یہ کہانی آج یہاں یو پی پریس کلب میں شکاگو یونی ورسٹی (امریکہ) کے اردو کے معلم چودھری محمد نعیم صاحب نے سنائی۔

نعیم صاحب جو طویل رخصت پر وطن آئے ہوئے ہیں لگ بھگ ۹ برس سے امریکا میں اردو کی تعلیم کا کام کر رہے ہیں اور اس مدت میں انھوں نے اور ان کے بعض امریکی ساتھیوں نے جن میں جناب جان گمپرز خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اردو پڑھانے کا ایک اچھا جامع نصاب تیار کر دیا ہے جو اب امریکا کی ان ۶ یونی ورسٹیوں میں استعمال ہوتا ہے جہاں اردو کی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے۔

نعیم صاحب نے بتایا کہ امریکا میں اردو کی کہانی دراصل ۱۹۵۲ء سے شروع ہوتی ہے جب کہ راک فیلر فاؤنڈیشن کے ایک عطیہ سے دکن کالج پونا میں لسانیات کے گرمائی اسکول کا آغاز ہوا۔ یہاں آنے والے امریکی استادوں نے بقدر ضرورت مختلف ہندوستانی زبانیں سیکھیں اور جب وہ واپس امریکہ گئے تو انھوں نے اپنی اپنی یونی ورسٹیوں میں ان زبانوں کی تعلیم کا بندوبست کیا۔ پروفیسر نارمن براؤن نے اس سلسلے میں اردو کی تعلیم شروع کی۔ لیکن ان استادوں کا مقصد محض بول چال کی زبان سکھا دینا تھا، رسم خط اور ادب سے واقفیت ان کا مقصد نہ تھا۔

امریکا میں اردو سکھانے کے لیے کوئی نصاب کی کتاب بھی نہ تھی صرف امریکی سپاہیوں کو اردو سے واقف کرانے کے لیے ایک کتاب تھی۔ ۱۹۵۷ء میں نعیم صاحب کا تقرر کیلی فورنیا یونی ورسٹی میں بحیثیت اردو کے استاد کے ہوا اور اس وقت نصابی کتابیں تیار کرنے کا کام شروع ہوا چنانچہ پہلی کتاب "اردو ریڈر" کے نام سے جناب جان گمپرز نے تصنیف کی جس میں انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے اسی لسانی اصول کی پیروی کی ہے، جس پر جناب حیات اللہ انصاری نے اپنا "قاعدہ" "دس دن میں اردو" لکھا ہے۔

اس کے بعد پھر دوسرے درجہ اور تیسرے درجہ کے طلبہ کے لیے مختلف کتابیں جناب گمپرز اور جناب نعیم نے لکھیں جن میں اردو کے ادب کے نمونوں کو پیش کیا گیا اور الفاظ کے ثقافتی پس منظر اور محاوراتی استعمال پر روشنی ڈالی گئی۔

نعیم صاحب نے ایک کتاب ان لوگوں کے لیے بھی تصنیف کی ہے جو اردو نہیں جانتے لیکن تقابلی ادب کے مطالعہ کے سلسلے میں اردو ادب سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ شکاگو سے "ایشیا کی جل پری" ایک رسالہ "محفل" کے نام سے نکالتے ہیں جس میں جنوبی ایشیا کی زبانوں کے ادب کے تراجم ہوتے ہیں۔

(قومی آواز)

مراسلات

ساڑھے چھ اور سوا پانچ

۲۲ مارچ ۶۶ء (جلد ۲۵، شمارہ ۱۲) کے 'ہماری زبان' میں 'سیر بین' کے عنوان کے تحت ایک شذرہ میں ساڑھے چھ اور سوا پانچ کو ہندسوں میں لکھنے کا مسئلہ زیر بحث لایا گیا ہے اور 'ہماری زبان' کے پڑھنے والوں کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی ہے۔

عدد صحیح اور اس کے ساتھ کسر کی علامت لکھنے کے طریقے کا ذکر کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ میں رقوم اور اعداد لکھنے اور ان کے ہندسوں میں ظاہر کرنے کے طریقے سے گفتگو کی جائے۔

رقوم ہندسوں میں اعداد کے مراتب کے لحاظ سے بائیں سے داہنی طرف کو لکھتے ہیں۔ رقم چاہے کتنی ہی زیادہ ہو بائیں سے شروع کر کے پہلے اعلیٰ اعداد لکھتے ہیں پھر درجہ بدرجہ داہنی طرف کو ادنیٰ اعداد لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً اگر رقم لاکھوں ہزاروں پر مشتمل ہے تو پہلے بائیں طرف سے شروع کر کے دس لاکھ، لاکھ، دس ہزار، ہزار، سیکڑا، دہائی، اکائی تک اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف بائیں سے داہنی کی سمت جاتے ہیں۔ اکائی انتہائی ادنیٰ عدد صحیح ہے یہ سب کے آخر میں بائیں کے داہنی طرف لکھی جاتی ہے۔ بولنے اور رقوم کے الفاظ میں لکھنے میں بھی حفظ مراتب کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اور بائیں سے داہنی کی طرف پڑھتے ہیں۔ مثلاً موجودہ سنہ ہجری کو ایک ہزار تین سو پچاسی بولتے ہیں اور ہندسوں میں درج کرتے وقت بائیں سے داہنی ایک ہزار سے شروع کر کے ۱۳۸۵ کو پانچ کی اکائی پر ختم کرتے ہیں۔

فارسی اردو ہندی اور انگریزی کی تقریر و تحریر میں رقوم کو الفاظ میں ادا کرنے اور ہندسوں میں لکھنے کا یہی طریقہ اور اصول ہے کہ ادنیٰ عدد کی نشست اعلیٰ کے داہنی طرف ہوتی ہے پاؤ ($\frac{1}{4}$)، آدھا ($\frac{1}{2}$)، پون ($\frac{3}{4}$)، سوا ($1\frac{1}{4}$)، ساڑھے ($2\frac{1}{2}$) اور پونے ($3\frac{3}{4}$) مختلف کسور ہیں۔ یہ بدیہی بات ہے کہ کسر عدد صحیح یا سالم رقم سے ادنیٰ درجہ کی ہوتی ہے اس لیے کسر کو ہندسوں میں لکھا جائے تو اس کا مقام ادنیٰ ہونے کی حیثیت سے مراتب اعداد کے لحاظ سے عدد صحیح اکائی کے داہنی جانب ہونا چاہیے۔

لہٰذا اصولاً ۶$\frac{1}{2}$ اور ۵$\frac{1}{4}$ ہی صحیح ہے۔ اور ساڑھے چھ کو $\frac{1}{2}$۶ اور سوا پانچ کو $\frac{1}{4}$۵ لکھنا مروجہ و مسلمہ رسوم و آئین سے انحراف کرنا ہے۔

کسر کو بٹے کی صورت میں لکھنے کی بجائے اعشاریہ میں بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔ ساڑھے چھ کو ۶.۵۰ سوا پانچ کو ۵.۲۵ اور پونے پانچ کو ۴.۷۵ لکھتے ہیں۔ اس صورت میں بھی کسور اعشاریہ عدد صحیح کے داہنی جانب ہوتی ہیں اور صحیح و کسر میں تمیز کے لیے بیچ میں اعشاریہ کا نشان (.) لگا دیتے ہیں۔ بولنے میں بھی اس کا خیال رکھتے ہیں۔ ساڑھے چھ سوا پانچ اور پونے پانچ نہیں کہتے۔ اس کی بجائے چھ اعشاریہ پانچ صفر، پانچ اعشاریہ دو پانچ اور چار اعشاریہ سات پانچ بولتے ہیں۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آخر یہ مسئلہ پیدا ہی کیوں ہوا کہ کسر کو عدد صحیح کے داہنی جانب لکھا جائے یا بائیں طرف۔ یہ الجھن داخلی اور حقیقی ہے۔ اس کی وجہ وہ تضاد ہے جو اردو فارسی رسم الخط اور مراتب اعداد کی تقریر و تحریر میں ہے۔ اردو اور فارسی میں حروف الفاظ و عبارات لکھنے میں داہنی طرف سے بائیں کی جانب رفتار ہوتی ہے برخلاف اس کے رقوم کو بولنے اور لکھنے میں بائیں سے داہنی کو قلم اور زبان چلتے ہیں۔ ابتدائی مدارس میں گنتی لکھنا سکھاتے وقت اس الجھن کا بہت تلخ تجربہ ہوتا ہے۔ بعض بچے تو بڑے ہونے تک ۸۲ کو ۲۸ اور ۸۴ کو ۴۸ لکھ جاتے ہیں۔

عربی میں البتہ بہت معقول طریقہ ہے: "بولتے وقت آحاد کو پہلے بولیں گے پھر عشرات کو پھر مات کو پھر اور الوف سب سے پیچھے آئے گا۔ اور ہر درجہ کے بعد و عاطفہ بڑھائی جائے گی" (کتاب الصرف، حافظ عبدالرحمٰن امرتسری)۔ رقوم کو الفاظ میں ادا کرنے کا یہ طریقہ عربی رسم الخط کے عین مطابق ہے مگر اردو میں اسی ترتیب سے بولنا اور لکھنا بڑا عجیب سا اور بے تکا معلوم ہوگا۔

اب اگر ہم اردو رسم الخط کا لحاظ کر کے منطق کو اس کی انتہا تک پہنچائیں اور 'جیسے بولو ویسے لکھو' پر عمل کریں تو دو ہزار تین سو پینتالیس کو بجائے ۲۳۴۵ کے ۵۴۳۲ لکھنا پڑے گا۔ اس سے حساب کتاب اور کاروبار میں جو خلل واقع ہوگا وہ ظاہر ہے۔ سالہا سال ہوئے ہم کو طبائع ہندسوں کی اس ترتیب تحریر سے مانوس ہوں۔

رہا کسور کو داہنی یا بائیں لکھنے کا سوال، جو وابستہ ہے مراتب اعداد اور ہندسوں کی ترتیب تحریر سے، آج کل خود بخود حل ہوتا جا رہا ہے۔ اب نہ آنے پائی رہے نہ من سیر چھٹانک نہ گز اور گرہ۔ ہونے کے لیے میٹرک سسٹم رائج ہو رہا ہے اور طریق اعشاریہ میں لکھا جا رہا ہے یہ صورت حال ہے تو اب نہ سوا کی ضرورت رہی نہ ساڑھے کی نہ پونے کی رفتہ رفتہ یہ الفاظ بھی متروک ہوتے جائیں گے۔ وقت بتانے کے لیے بھی بٹے ($\frac{1}{4}$، $\frac{1}{2}$ اور $\frac{3}{4}$) میں کسور ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں رہی اس مقصد کے لیے ریل اور فوج میں رائج طریقہ بہترین ہے صبح و شام کے ساڑھے چھ بجے لکھنے کی بجائے ۶:۳۰ گھنٹے اور ۱۸:۳۰ گھنٹے لکھنا کافی ہے۔ رات کے پونے بارہ ۲۳:۴۵ گھنٹے ہو گئے اور سوا بارہ ۰۰:۱۵ گھنٹے۔ جب بٹے ہی نہیں رہے تو ان کے داہنی بائیں لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں کوئی نیا طریقہ متعین کرنے کی ضرورت نہیں ہے یہ مسئلہ بالیقین طے کر دیا ہے۔

ڈاکٹر نورالعین صدیقی

یہ بوالعجبی!

"ہماری زبان" کے تازہ شمارہ (۲۲ مارچ) میں عبدالحی رضا صاحب کی تجویز اور ڈاکٹر جعفر حسن صاحب کے مراسلے پر نوٹ پڑھ کر کچھ تعجب سا ہوا کہ اردو والے شعر و سخن، تنقید و تحقیق، اردو کے موقف، سیمینار اور سمپوزیم، وغیرہ جیسے اہم مسئلے چھوڑ کر ان فضول باتوں کی طرف کیوں متوجہ ہو گئے۔ الفاظ کے معنی میں مختلف SHADE کا جاننا کیوں ضروری ہونے لگا؟ نثر ہو یا نظم، کیا مستند ہے میرا فرمایا ہوا کافی نہیں ہے؟ زبان کسی کی جاگیر نہیں، ہم کسی کی تقلید کیوں کرنے لگے؟ "اس محفل میں بہت سے حضرات بیٹھے تھے" میں "حضرات" کی جگہ "لوگ" کیوں لکھیں؟ اور اگر کوئی لکھتا ہے "اس شہر میں چار لاکھ لوگ بستے ہیں" تو یہاں "لوگ" کی جگہ "آدمی" کیوں ہونا چاہیے؟ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی، ہم کے لیے" یاران نکتہ داں کو صدائے عام دی جائے!

جعفر حسن صاحب نے "۶½" اور "½۶" کی بحث بے کار چھیڑ دی۔ ماشاءاللہ ہمارے بچے انگریزی اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ انھیں تو کوئی تکلیف نہیں ہو رہی ہے۔ اب رہے وہ غریب غربا جو اپنی بدنصیبی سے کسی اسلامیہ اسکول اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ان کا کیا؟ پڑھا پڑھا نہ پڑھا۔ ہم اردو کالج اور اردو یونیورسٹی چاہتے ہیں پرائمری سے یونیورسٹی تک اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا ہمارا مطالبہ ہے یعنی ریاضی، سیاسیات، سائنس، عمرانیات، معاشیات وغیرہ سب کچھ اردو ہی میں پڑھا جائے۔ اس کے بعد یہ کتنی احمقانہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سنہ ۱۹۶۶ء میں ہم یہ پوچھ رہے ہیں کہ "ساڑھے چھ" ہندسوں میں کیسے لکھا جائے، یہ بات "ہماری زبان" کے صفحے پر پوچھنے کے بجائے کسی مولوی صاحب یا ماسٹر صاحب سے پوچھنی چاہیے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ نہ صرف سوال پوچھ رہے ہیں بلکہ ایک طرف ڈاکٹر جعفر حسن صاحب جیسے بزرگ اسے "۶½" لکھنے کا مشورہ دیتے ہیں تو دوسری طرف انجمن ترقی اردو کے سرکاری ترجمان کے مدیر کی رائے میں اسے "½۶" لکھنا چاہیے کیونکہ اردو داہنی طرف سے لکھی جاتی ہے۔ اس دلیل کی بنیاد پر تو ایک سو پچیس کو "۵۲۱" لکھنا چاہیے۔

راقم کو پاکستان میں شائع شدہ بعض درسی کتابیں دیکھنے کا موقع ملا۔ اردو میں الجبرا کی کئی کتابیں سامنے تھیں۔ ان میں الجبرا کی ایک ہی عبارت مثلاً [illegible]
مختلف کتابوں میں اس طرح لکھی ہوئی تھی۔

(۱) ب۲ + ۲ ب ج + ج۲

(۲) ج۲ + ج ب ۲ + ۲ب

(۳) ۲ج + ج ب ۲ + ب۲

(۴) ۲ج + ج ب ۲ + ۲ب

یہ ہے ایک ادبی، علمی اور ثقافتی زبان اردو کی شان!

(اقتدار حسینی)

استفسار

حال ہی میں مجھے فارسی زبان میں اصول انشا و اقسام نثر سے متعلق کسی کتاب کا مخطوطہ دستیاب ہوا ہے۔ مصنف کا تخلص فائق ہے۔ اس کے والد کا نام "رنجیت رائے کالیستھ" ہے۔ ابتدائی عمر میں وہ خود "نواب جانباز خاں بہادر" کی سرکار میں "بخدمت خطوط نویسی ملازم" رہا تھا۔ اس ملازمت کا زمانہ ۱۱۳۱ھ کے قریب ہے اور اس کے والد رنجیت رائے کا ۱۰۹۳ھ تک بقید حیات ہونا ثابت ہے۔ فائق نے نواب سعادت علی خاں تک کا زمانہ پایا تھا۔ خیال ہے کہ شاید آخر عمر میں مسلمان ہو گیا تھا چنانچہ کہتا ہے۔

فائق دوگانہ کرد بمحراب آں ادا
تاریخ گفت خضر کہ قد قامت الصلوٰۃ

ممکن ہے کہ اسے دربار میں بھی رسائی حاصل ہو گئی ہو۔

آب حیات میں کسی فائق کا تذکرہ اس طرح ملتا ہے کہ اس نے انشاء اللہ خاں انشا کی ہجو کہی تھی۔ انشا نے اسے کچھ انعام دیا اور اس سے متعلق دو اشعار پر مشتمل قطعہ بھی کہا۔ خیال ہوتا ہے کہ یہ فائق اور کتاب مذکور کا مصنف ایک ہی شخص تھا۔ اس سلسلے میں اگر کوئی صاحب "ہماری زبان" کے توسط سے کچھ معلومات بہم پہنچا دیں تو شکر گزار ہوں گا۔

(محمد انصار اللہ نظر)

طلبا یا طلبہ

(۱) میرا خیال ہے کہ طالب کی جمع طلبہ، طلاب اور طالبین ہوتی ہے مگر "ہماری زبان" (۸ مارچ ۶۶ء) کے اداریہ میں طلبا دیکھ کر حیرت ہوئی۔ کیا اہل نظر حضرات اس پر روشنی ڈال کر استفادہ کا موقع دیں گے؟

(۲) سید عبدالحی رضا صاحب کی تجویز اردو الفاظ کے صحیح طریقہ استعمال کے بارے میں بہت ہی مناسب ہے۔ اس سلسلے میں اگر ادارہ خود پہل کرے تو بعید نہیں اور حضرات بھی اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔ جدید علوم و فنون کی اصطلاحات کا ترجمہ بھی اسی سلسلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح جدید موضوعات پر کتابیں لکھنے میں سہولت تو ہوگی ہی اصطلاحات کے ترجمہ میں یکسانیت بھی پیدا ہوگی۔ اس لیے اس کی طرف توجہ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔

(۳) آج کل "رہائش" کا استعمال عام ہو رہا ہے جیسے طرز رہائش، رہائش گاہ وغیرہ۔ کیا رہائش کو اردو کا لفظ قرار دیا جا سکتا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا اردو الفاظ کی تشکیل اس طرح ہو سکتی ہے؟ اور اگر جواب نفی میں ہے تو پھر رہائش کا اردو مترادف کیا ہے؟

(غضنفر شبلی)

انجمن ترقی اردو لکھنؤ کی مجلس عاملہ کا جلسہ

لکھنؤ ۴/اپریل۔ انجمن ترقی اردو لکھنؤ کی عاملہ کا ایک جلسہ جناب مولانا عرشی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں جو اہم تجاویز پاس کی گئیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

ایک تجویز کے ذریعہ ریاستی شاخ انجمن ترقی اردو اتر پردیش سے درخواست کی گئی کہ وہ یو پی میں جو اردو کا خاص مرکز ہے ہائی اسکول تک اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی موثر کوشش کرے اور ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی طرح جیسے آندھرا، بہار وغیرہ وغیرہ یہاں بھی اردو اسکول قائم کرائے تاکہ اردو پڑھنے والے طلبا اپنی مادری زبان کی تعلیم سے محروم نہ رہیں اور ان کا دل و دماغ مفلوج ہونے سے بچ جائے۔ ایک اور تجویز کے ذریعہ انجمن ترقی اردو لکھنؤ کا ایک وفد جلد از جلد وزیر نقل و حمل و وزیر لوکل سلف گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کمشنر اور لکھنؤ کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر سے ملے گا اور انھیں ان کے محکمہ جات میں جو سلوک اردو کے ساتھ کیا جا رہا ہے اس پر بات چیت اس روشنی میں کرے گا کہ مردم شماری کی رو سے لکھنؤ کو اس خطہ میں شامل کیا گیا ہے جہاں اردو بولنے والوں کی اکثریت ہے۔ انجمن ایک تعلیمی مہم بھی چلانے والی ہے جس کا پروگرام تیار کیا جا رہا ہے اور محرم کے بعد انجمن کا سالانہ انتخاب بھی کرنا طے ہوا۔ تعلیمی مہم کے سلسلہ میں ایک کتابچہ شائع کیا جائے گا جس میں بتایا جائے گا کہ اردو کو مادری زبان کی حیثیت سے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے اور نہ پڑھنے سے کیا نقصانات ہوں گے۔

(الجمعیۃ دہلی)

برہم ناتھ دت قاصر کی ادبی خدمات کا اعتراف

چنڈی گڑھ ۲۰/مارچ۔ ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ مشہور ادیب جناب برہم ناتھ دت صاحب قاصر کی ادبی خدمات کا اعتراف محکمہ السنہ پنجاب کی سالانہ ادبی جشن میں ۲۰/مارچ ۱۹۶۶ء کو چنڈی گڑھ میں کیا گیا۔ ادبی جشن کی صدارت پنجاب کے گورنر جناب اجل سنگھ نے کی۔ اس موقع پر دت صاحب کی خدمت میں سپاس نامہ، خلعت فاخرہ و کیسۂ زر پیش کیا گیا۔ سپاس نامہ کے جواب میں برہم ناتھ صاحب نے ایک بصیرت افروز تقریر کی۔ اردو زبان و ادب کے بارے میں انھوں نے کہا اردو ایک ہندی اور سیکولر زبان ہے، ہندی نژاد ہے کہیں باہر سے نہیں آئی، ہماری مشترکہ تہذیب کی علامت و شناخت ہے، اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف اقوام کے میل جول، پیار و اخلاص باہمی رواداری اور خلوص نیت کا مظہر اور وسعت قلب، کشادہ دلی، فکر اور سیاسی بصیرت کا ثبوت ہے۔ اس کی نشوونما میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی شعراء و ادباء کا برابر کا حصہ ہے۔ سب کی ساجھی میراث ہے اور ابتداء سے آج تک یہ اشتراک بہت عیاں ہے۔ خان آرزو سے آنند رام مخلص اور ٹیک چند بہار کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ آتش ہیں تو دیا شنکر نسیم بھی ہیں، غالب ہیں تو ان کے چہیتے مرزا ہرگوپال تفتہ بھی ہیں، داغ ہیں تو امر قیصر کے کیسرا سنگھ جہانگیر بھی ہیں۔ مسلمان شعراء کے ساتھ ساتھ رائے سرب سنگھ دیوانہ، رتن ناتھ سرشار، درگا سہائے سرور، برج نارائن چکبست، تلوک چند محروم بھی ہیں کہ اپنے اپنے دور کے استاد ہو گزرے ہیں اور شعر و شاعری کے معرکوں میں کامیاب و کامران رہے ہیں، دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اس کی ہمہ گیری، ہم آہنگی اور مشارکت کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ پنجاب سرکار نے جن پانچ مشاہیر کو اعزاز کا مستحق سمجھا ان میں دو سکھ ہیں اور تین ہندو۔ غرض کہ یہاں بھی یہ اشتراک واضح و آشکار ہے۔

اردو ایک کیمیائے سعادت ہے کہ ہمارے گھر میں پڑی ہے اور ہم اس سے بے خبر ہیں۔ اس جنس عزیز کو باسی آب و رنگ سے ملوث کرنا اور نظر انداز کر دینا ایک بڑا المیہ ہوگا۔ اور اس متاع گرانمایہ کو اپنے ہاتھوں ہمسایہ ملک کے حوالے کر دینا ایک ایسا سانحہ ہے جس کا تصور ہی دل کو مضطرب و بے چین کر دیتا ہے۔ بات تو تب تھی کہ اس لطیف و پاکیزہ ورثہ کو توسیع و ترقی دی جاتی مگر افسوس اس کی وسعت کو تنگ، اس کے دائرے کو محدود اور اس کی ترقی کو مسدود کیا جا رہا ہے۔

اردو کی ہردل عزیزی کا یہ عالم ہے کہ مشاعرے کا اعلان کر دیکھو تل دھرنے کو جگہ نہ ملے گی اور پنڈال نعرہ ہائے تحسین سے گونج اٹھے گا اور شائقین برخاست تک اٹھنے کا نام نہ لیں گے اور بعد کو مدتوں اس کا چرچا کرتے رہیں گے۔

اردو کی امتیازی صورت یہ ہے کہ ہندوپاک کے ہر گوشہ میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ اور ہر جگہ اس کے پرستار اور خدمت گزار موجود ہیں۔ اس کی ملاحت، شیرینی اور مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کے اشعار زبان زد عام و خاص ہیں؛ صرف مطربان خوش جمال ہی نہیں بلکہ بچہ، بڈھا، زن، مرد، مزدور، سرمایہ دار سب اپنی اپنی دھن میں انھیں الاپتے اور گنگناتے پھرتے ہیں۔ اور اپنے لیے تسکین قلب اور لطف و مباہات کا سامان پیدا کر لیتے ہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ دوسری زبانوں کے شیدائی بھی اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں، اپنے اشتہاروں، اعلانوں، عنوانوں، اخباروں اور خطبوں میں اسی زبان کا سہارا لیتے چلے آ رہے ہیں اور ان کے گرامی قدر شعراء اور ادیب اپنا تخلص مسافر، سفیر، دیوانہ، امن، طالب، عاجز، سوز، گوہر کیے ہوئے ہیں اور ان میں سے چند ایک علامہ بھی کہلاتے ہیں۔ یہی نہیں، رسم الخط بدل گیا تو پھر کیا اردو اس پیکر میں بھی بصد آب و تاب جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔

"تاشقند اسپرٹ کا بھی یہی تقاضا ہے کہ پاکستان کے ساتھ

تجارتی، ثقافتی، اقتصادی تعلقات کی پائداری کے لیے اس کو اپنایا جائے اور اس کی ترقی کو مقدم سمجھا جائے اور ایسے ذرائع اختیار کیے جائیں جن سے یہ زبان فروغ پا سکے تاکہ دونوں ممالک میں یگانگت کے رجحانات کو استواری ملتی رہے۔

حکومت اردو ادیبوں اور شاعروں کو اعزاز بخشتی ہے، راج کوی (ملک الشعرا) بنا رہی ہے وظائف عنایت کر رہی ہے، امداد بانٹ رہی ہے، مشاعروں میں ان کی سرپرستی فرما رہی ہے اور تصنیفات پر انعام دیتی ہے۔ یہ اقدامات اپنی جگہ بڑے مستحسن اور قابل قدر ہیں اور جاری رہنے چاہئیں اس سے مشاہیر کی عزت افزائی، حوصلہ افزائی اور تکریم و تنظیم تو ہوتی ہے اور حصولِ منفعت کا ذریعہ بھی ہے مگر اردو علم و ادب کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔ نئی نسل اردو رسم الخط سے بھی ناآشنا ہوتی جا رہی ہے، کتابیں ارباب ذوق کے لیے لکھی جاتی ہیں، مصنف کے اپنے مطالعے کے لیے نہیں۔ جب مدارس یا مکاتب میں اردو ذریعہ تدریس سے خارج کی جا رہی ہو اور عدالتوں اور دفاتر میں اس کا چلن نہ ہو رہا ہو تو پھر باقی کیا رہ گیا۔ ذوق ادب آپ سے آپ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ پڑھنے والے یہاں تو ہوں گے نہیں باہر سے درآمد کرنے پڑیں گے، کتابیں کن کے لیے لکھی جائیں گی، اور کس کام آئیں گی؟ یہ پہلو قابل غور ہے جس پر حکومت کو توجہ دینا ضروری ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ایسی کمزوریوں کے باوجود نئے ڈھانچے میں اردو کو نظر انداز نہ کیا جائے گا اور حکومت اپنی توجہ اس طرف مبذول کرے گی۔

قدح پر کن کہ من از دولتِ عشق
جوان بخت جہانم گرچہ پیرم

(نامہ نگار)

آندھرا پردیش کونسل میں سرکاری زبان بل منظور

اردو کی تائید میں اہم تقاریر

حیدرآباد۔ یکم اپریل۔ قانون ساز کونسل آندھرا پردیش نے آج ایوان کے تمام گوشوں کی مکمل تائید سے آندھرا پردیش سرکاری زبان بل منظور کر لیا۔ یہ بل اسمبلی میں منظور کیا جا چکا ہے۔ ارکان کونسل نے اپنے متفقہ خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سرکاری زبان بل کی منظوری سے آندھرائی عوام کی دیرینہ امیدیں پوری ہوں گی۔ اراکین کونسل نے قانون کی عاجلانہ عمل آوری پر زور دیتے ہوئے اس کی تعمیل کی نگرانی کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دینے کی خواہش کی۔ جناب مخدوم محی الدین نے سرکاری زبان بل پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تلگو کو سرکاری زبان بنانا آندھرائی عوام کی دیرینہ تمنا تھی۔ علیحدہ ریاست آندھرا کے لیے جد و جہد بھی اسی نقطۂ نظر کے تحت شروع کی گئی تھی اور آندھرائی عوام ہی نے پہلی لسانی ریاست قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ سرکاری زبان بل میں دفعہ ۳ کی خصوصی گنجائش پیدا کرنے اور اس کے تحت اردو یا کوئی دوسری زبان یا زبانوں کو تلگو کے ساتھ ساتھ ریاست کے مخصوص علاقوں میں، انہی سرکاری مقاصد کے لیے اور اتنے ہی عرصے کے لیے جیسا کہ نوٹیفکیشنز میں درج ہوگا استعمال کرنے کا موقع دینے پر جناب مخدوم محی الدین نے چیف منسٹر اور حکومت کا شکریہ ادا کیا۔ جہاں تک "اردو" کا تعلق ہے ریاست آندھرا پردیش کے تمام چیف منسٹروں نے اسے جاری رکھنے اور اسے تحفظ دینے کا یقین دلایا ہے۔ اردو کے تحفظ کے سلسلہ میں ماضی میں کئی گورنمنٹ آرڈرس جاری کیے گئے۔ انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ جیسے ہی بل قانون کی شکل اختیار کر لے حکومت کو چاہیے کہ وہ ان تمام گورنمنٹ آرڈرس کو روبہ عمل لائے بغیر کسی تاخیر کے مناسب نوٹیفکیشن جاری کر دے۔ جناب مخدوم محی الدین نے کہا کہ سرکاری زبان بل کی دفعہ ۳ میں تلگو زبان کے ساتھ ساتھ دوسری اقلیتی زبانوں کی متعلقہ علاقوں میں وہاں کے عوام کے مفادات کے پیش نظر استعمال کرنے کی گنجائش فراہم کی گئی ہے لیکن اس دفعہ میں کہا گیا ہے کہ اقلیتی زبان اتنے ہی عرصہ کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے جیسا کہ نوٹیفکیشن میں تعین ہوگا۔ دفعہ کا یہ حصہ "دیے گئے عرصہ کے لیے" حذف کر دیا جائے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک مخصوص اقلیت کی زبان کا ایک مقررہ وقفہ کے لیے تحفظ کیا جائے گا اور وہ استعمال کی جا سکے گی لیکن جیسے ہی یہ عرصہ ختم ہوگا عوام کو اس دیے گئے وقفہ کی مدت میں توسیع کے لیے حکومت سے درخواست کرنا پڑے گی۔ اس لیے انھوں نے مدت کے تعین کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے مزید کہا کہ اس کی وجہ سے عوام کے ذہنوں میں شبہات پیدا ہوں گے اس لیے اس کو حذف کر دیا جائے۔

صدر نشین قانون ساز کونسل جناب آنندم نے بل کی تائید کرتے ہوئے اس کو ترقی پسندانہ بل قرار دیا۔ انھوں نے اس کی تدریجی عمل آوری کا پروگرام مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کرنے کی خواہش کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے تعلق سے کسی کے ذہن میں شبہات نہیں ابھرنا چاہئیں۔ کیونکہ یہ کسی مخصوص طبقہ کی زبان نہیں ہے بلکہ ۵۵ تا ۶۰ فیصد عوام اسے بولتے ہیں۔ جناب آنندم نے کہا کہ اردو کی کوئی علیحدہ ریاست نہیں ہے۔ لیکن ہر ریاست میں عوام کی اکثریت اردو بولتی ہے۔ سابقہ ریاست حیدرآباد میں ریاست کی سرکاری زبان اردو تھی۔ اردو تکنیکی طور پر ایک ترقی یافتہ زبان ہے۔

ڈاکٹر گنگا راجو نے اردو کو فلسفیانہ اور میٹھی زبان قرار دیتے ہوئے کہا کہ اردو قومی یکجہتی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ [illegible]

اعلان پر دستخط ثبت کرنے کا وسیلہ بھی بنی ہے۔ کیونکہ تاشقند میں بحث کا زیادہ تر حصہ اردو ہی پر مشتمل ہوتا تھا انھوں نے سرکاری زبان بل کی دفعہ ۵ میں دوسری زبانوں کے تذکرہ کو ضروری خیال نہیں کیا۔

مولانا ابو یوسف نے اردو کو حکومت کی طرف سے وقتاً فوقتاً دیے جانے والے تحفظ کے بعد اسے "قانونی تحفظ دینے" پر حکومت کا شکریہ ادا کیا انھوں نے کہا کہ سابقہ ریاست حیدرآباد میں یہ ثابت کر دیا گیا تھا کہ حکومت کے انتظامی امور کے لیے اور تعلیم کے لیے اردو زبان مناسب اور موزوں ہے عثمانیہ یونیورسٹی نے ۴۰ سال کے طویل عرصہ تک یہ کامیاب تجربہ جاری رکھا تھا۔

جناب اے سیتا رام ریڈی نے سرکاری زبان بل کو آندھرائی عوام کی دیرینہ آرزوؤں کی تکمیل قرار دیتے ہوئے اس کی ترقی اور ترویج اور اسے مقبول بنانے کی ضرورت واضح کی انھوں نے اردو اور دوسری اقلیتی زبانوں سے متعلقہ دفعہ کی تائید کرتے ہوئے اس دفعہ میں دوسری زبانوں مرہٹی کنڑی وغیرہ کا تذکرہ شامل کر دینے کی بھی خواہش کی۔

جناب پی وی رنگو اچاری نے سرکاری زبان بل پر حکومت کو مبارکباد دی اور اردو زبان کے تحفظ کے لیے شامل کی جانے والی دفعہ کا حوالہ دیتے ہوئے اس میں دوسری زبانوں کی شمولیت کی بھی خواہش کی

وزیر قانون جناب وی کے نرسمہا راؤ جنھوں نے قانون ساز کونسل میں اس بل کو پیش کیا تھا کہا کہ سرکاری زبان بل میں کمیشن قائم کرنے کے بارے میں جو دفعہ شامل کی گئی ہے اس کا مقصد ہی تلگو کو سرکاری زبان بنانے کے پروگرام کی عمل آوری پر نظر رکھنا ہے سرکاری اور غیر سرکاری افراد پر مشتمل مشاورتی طرز کی ایک کمیٹی تشکیل دینے سے چیف منسٹر جناب کے برہمانند اریڈی نے پہلے ہی اتفاق کر لیا ہے تلگو کو سرکاری زبان بنانے کے سلسلے میں پیش رفت کے تعلق سے حکومت کو مشورے دے گی۔ وزیر قانون نے کہا کہ تلگو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے بتدریج ضروری اقدام کیا جائے گا انھوں نے کہا کہ علاقہ تلنگانہ کے بہت سارے لوگ جن کی مادری زبان تلگو ہے روزمرہ کے کاروبار اردو میں کرتے ہیں۔ وزیر قانون نے کہا کہ سرکاری زبان بل کی دفعہ ۵ محتاط غور و خوض اور مختلف اقلیتی زبانوں کے نمائندوں سے تبادلۂ خیال کا نتیجہ ہے۔ مذکورہ دفعہ اقلیتی زبانوں کو تحفظ دینے کے لیے شامل کی گئی ہے یہ ایک مثالی دفعہ ہے جو آندھرا پردیش کی آزادانہ لسانی پالیسی کی مظہر ہے ریاست کے مختلف طبقوں کے عوام کے مطالبات کا یہ ایک منصفانہ حل ہے۔ (نامہ نگار)

قانون ساز کونسل میں جناب مخدوم محی الدین کی تقریر

حیدرآباد۔ یکم اپریل قانون ساز کونسل میں آج مسودہ قانون سرکاری زبان پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے جناب مخدوم محی الدین (قائد کمیونسٹ گروپ) (دایاں بازو) نے تلگو کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دینے کی اقدامات پر چیف منسٹر جناب کے برہمانند اریڈی کو مبارکباد دی۔ انھوں نے کہا کہ جہاں تک تلگو کو سرکاری زبان قرار دینے کا تعلق ہے زیر بحث مسودہ قانون کے ذریعہ عوام کی ایک دیرینہ خواہش اور جدوجہد کی تکمیل کی گئی ہے جناب پی وی نرسمہاراؤ نے سرکاری زبان بل پیش کیا یہ اسمبلی میں منظور کیا جا چکا ہے جناب مخدوم محی الدین نے کہا کہ ہندوستان کو جمہوریہ قرار دینے کے بعد انتظامی اور تعلیمی ڈھانچہ کی ترقی اور کارکردگی میں اضافہ کی خاطر مختلف زبانوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ریاستی حکومت نے بھی تلگو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اب تک اس راہ میں موانعات حائل ہوتی رہیں جنھیں اب دور کر لیا گیا ہے تاہم مطلوبہ مقصد کی تکمیل کے لیے قانون سازی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے تلگو کو سرکاری زبان قرار دینا ضروری ہے جناب مخدوم کی نے رابطہ کی زبان کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ انگریزی کی بجائے ہندی کو رابطہ کی زبان کی حیثیت سے رائج کرنے کے لیے خصوصی توجہ دی جانی چاہیے جناب مخدوم محی الدین نے مسودہ قانون میں لسانی اقلیتوں کے لیے تحفظات کے تعلق سے بھی دفعہ شامل کرنے پر چیف منسٹر اور وزیر قانون کو مبارکباد دیتے ہوئے خاص طور پر مسودہ قانون کے دفعہ (۵) کو جس کے تحت اردو اور دیگر زبانوں وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے اقلیتی زبانوں کے تحفظات کے لیے ایک عملی اقدام قرار دیا۔

جناب مخدوم محی الدین نے اس خصوص میں ان تیقنات کا بھی حوالہ دیا جو اردو کے بارے میں تین چیف منسٹروں جناب این سنجیوا ریڈی جناب سنجیویا اور جناب کے برہمانند اریڈی نے دیے تھے انھوں نے اس جی۔ او کا بھی حوالہ دیا جو اردو کے استعمال کے بارے میں حکومت نے ۱۹۶۲ء میں جاری کیا تھا انھوں نے لسانی اقلیتوں کو دیے گئے تمام تیقنات کے سلسلہ میں بلا تاخیر نوٹیفکیشن جاری کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ کسی خاص علاقہ یا علاقوں میں اردو کے استعمال کا سوال بعد میں اٹھایا جا سکتا ہے لیکن تیقنات اور تحفظات پر مشتمل نوٹیفکیشن کے اجرا میں تاخیر نہیں کی جانی چاہیے جناب مخدوم محی الدین نے مسودہ قانون میں اقلیتی زبانوں سے متعلق فقرہ میں مدت کے تعین کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس کی وجہ سے عوام کے ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوں گے۔

(نامہ نگار)

"ہماری زبان"
کو مضامین و مراسلات بھیجتے وقت یہ خیال رکھیں کہ وہ کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوں

دشواریوں کے باوجود اردو کی ترقی جاری

بھوپال میں پروفیسر آل احمد سرور کی تقریر

بھوپال ۱۰ر اپریل۔ آج حلقہ ارباب ادب کا ایک خصوصی جلسہ پروفیسر آل احمد سرور کے اعزاز میں ہوا۔ جلسہ کی صدارت ہیبیٹ پروجیکٹ کے چیف انجینیئر میجر مرزا نسیم بیگ نے کی۔ اس موقع پر حمیدیہ کالج، سیفیہ کالج، آر بند و کالج اور گرلز کالج کے اردو پڑھنے والے طلبہ کی طرف سے حسنات صدیقی اور حلقہ ادب اور انجمن ترقی اردو بھوپال کی طرف سے حسن مسعود اور بزم فنکار کی طرف سے فضل تابش اور ادارہ فروغ اردو کی طرف سے قاسم نیازی نے سرور صاحب کو ہار پہنائے۔ جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے سرور صاحب نے کہا۔ اس وقت مجھے آپ سے جو گفتگو کرنا ہے وہ بلند آواز میں سوچنا ہے۔ میں آپ سے اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں گفتگو نہ کروں گا کیونکہ میں نجومی نہیں عاشق ہوں، چنانچہ جب مجھ سے اردو کے مستقبل کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو کہہ دیتا ہوں کہ جیسا حال ہے۔ اس لیے ہمیں گرد و پیش کے حالات سے مایوس ہونے کے بجائے اپنے سرمایہ پر فخر کرنا سیکھنا چاہیے۔

آزاد ہندوستان میں باوجود دشواریوں، زحمتوں اور پریشانیوں کے ہر خطے کے لوگ اپنے خون جگر کی ساری آب و تاب کے ساتھ اردو کے نقشے میں رعنائی پیدا کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ نئے نقشہ میں بھوپال کا نام روشن ہوگا اور لوگ احترام کریں گے کیونکہ اس نے بھی اردو کی اس ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے۔

ہم کو یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم وقت کے غلام ہیں اور نہ ہمیں خود کو مختار ہی سمجھنا چاہیے۔ لیکن اس پابندی کے باوجود جاندار لوگ اپنی جگہ بنا لیا کرتے ہیں ہم بھی اگر اس نقطہ نظر کو اپنائیں تو آگے بڑھ سکتے ہیں ہم کو غلط فہمیوں کے جال سے باہر نکلنا چاہیے حقیقت پسندی کی راہ اپنا کر دیکھنا چاہیے کہ ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے اس کے سامنے کئی مسائل ہیں۔ انھیں ایک دم حل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مثال ایک قافلے کی سی ہے۔ قافلہ جو بہت لمبا ہے اور مختلف لوگوں سے مل کر بنا ہے۔ اس میں سب ہی کو آگے بڑھنا ہے اور سب کو یہ حق ضرور رکھنا چاہیے۔ ہر ایک کو اظہار رائے کی آزادی ہونا چاہیے کیونکہ جمہوری ملک میں آزادی رائے ضروری ہے۔ اس لیے اگر کوئی اردو کی مخالفت کرتا ہے تو خفا مت ہوئیے آپ اپنی بات کہئے اسے سمجھائیے، اردو کا تو مزاج ہی جمہوری ہے اسے اس کا حق ضرور ملے گا یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ ایک زبان کی ترقی دوسری زبان کی ترقی کو نقصان پہنچاتی ہے ہر زبان اپنے بل پر زندہ رہتی ہے۔ اردو نہ صرف اپنے بل پر زندہ رہے گی بلکہ ترقی بھی کرے گی۔"

پروفیسر آل احمد سرور نے اپنی تقریر کے خاتمہ پر کہا کہ اردو زبان میں بڑی وسعت ہے اس کی ہر طرح سے خدمت ہو سکتی ہے وہ مشترکہ تہذیب کے شاندار کارناموں کا ثمر ہے۔ سرور صاحب کی تقریر سے پہلے پروفیسر آفاق احمد نے ان کا استقبال کیا اور کہا کہ آپ کی آمد سے اس سال حلقہ میں آنے والے اسکالرز کی فہرست مکمل ہو گئی ہے۔ صدر جلسہ میجر مرزا نسیم بیگ نے کہا کہ سرور صاحب کی تقریر نے اردو دوستوں کے دلوں میں نیا حوصلہ جگایا ہے۔ حکیم سید قمر الحسن مدیر اعلیٰ روزنامہ ندیم نے شکریہ ادا کیا۔ اس جلسہ میں بڑی تعداد میں ادبا، شعرا، اساتذہ و طلبہ، سیاسی و سماجی کارکنوں اور اردو دوستوں نے شرکت کی۔ (ایک نامہ نگار)

اردو شمال اور جنوب کو ملانے کا اہم ذریعہ

جناب کے راجندرا ریڈی ایم ایل سی کا بیان

حیدرآباد ۹ر اپریل جناب کے راجندرا ریڈی ایم ایل سی نے اسمبلی میں سرکاری زبان بل پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو اور تلگو کا سنگم ہو چکا ہے خصوصاً علاقہ تلنگانہ میں اردو اور تلگو اس قدر مل گئی ہیں کہ اردو الفاظ کے استعمال کے بغیر تلگو پوری طرح سے نہیں بولی جا سکتی۔ علاقہ تلنگانہ میں تلگو اردو کے ساتھ ملا کر بولی جاتی ہے جس طرح علاقہ آندھرا میں تلگو انگریزی کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ خانگی زندگی میں اور سرکاری کاروبار میں بھی اردو کے ساتھ تلگو ملا کر بولی جاتی ہے اس طرح ملا کر بولے بغیر تلگو زبان مکمل نہیں ہو سکتی۔ علاقہ تلنگانہ میں نہ صرف ہم لاکھوں لوگ اردو بولتے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگ اردو میں بات چیت کرتے، گو لاکھوں عوام کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ اس کے باوجود علاقہ تلنگانہ میں لاکھوں لوگ اردو بولتے اور سمجھتے ہیں اردو ملک کے شمال اور جنوب کو ملانے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اردو نہ صرف بین ریاستی زبان ہے بلکہ بین الاقوامی زبان بھی کہلائی جا سکتی ہے۔ کیونکہ دنیا کے دوسرے ممالک روس، پاکستان، ترکی، عرب جمہوریہ وغیرہ جیسے اہم ممالک میں بھی بولی جاتی ہے محض اس وجہ سے کہ تلگو کو دوسری ریاستوں میں اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ اس کا بدلہ اردو کے ساتھ نہیں لیا جانا چاہیے۔ اردو ہماری اور اپنی زبان ہے فرقہ وارانہ ذہنیت کی بنیادوں پر اس مسئلہ پر سوچنا بڑی غلطی ہے اردو کسی خاص فرقہ اور مذہب کی زبان نہیں بلحاظ مذہب اور ملت یہ زبان ہمارے آندھرا پردیش میں بولی جاتی ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں فرقہ وارانہ ذہنیت سے سوچا نہیں جا سکتا۔ چند تنگ نظر لوگ ہی آندھرا پردیش میں اردو کے بارے میں ایک فرقہ کی زبان کی بنیاد پر سوچ کر اس زبان کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ اردو ایک میٹھی اور آسان زبان ہے۔ اور قومی زبان ہندی کو حاصل کرنے کا ایک مدد راستہ ہے۔ اردو اور ہندی ایک ساتھ ساتھ چلتی ہیں، بولی میں بہت زیادہ فرق نہیں رہا ہے۔ اس کے علاوہ تلنگانہ اور آندھرا کے جذباتی انضمام میں اردو بہت ہی کارآمد ثابت ہوئی ہے اور مزید جذباتی انضمام کو پورا کرنے کے لیے اردو کو سرکاری تحفظ دینا نہایت ہی ضروری رہا ہے۔

(نامہ نگار)

تبصرے

وحید اختر

دیوانِ قائم

مرتب: ڈاکٹر خورشید الاسلام
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی
قیمت: ۷ روپے

قائم اردو کے اُن ممتاز اساتذہ میں سے ہیں جن کے فن کا اعتراف ہر دور کے صاحبانِ نظر نے کیا ہے۔ بعض تذکرہ نگار غزل میں انھیں میر کا ہم پلہ مانتے ہیں، اور یہ حقیقت بھی ہے کہ قائم اس صنفِ سخن میں اکثر اپنے معاصرین پر فوقیت رکھتے ہیں۔ قائم نے غزل کے علاوہ دوسری مروجہ اصناف قصیدہ، مثنوی، رباعی، ہجو سب ہی میدانوں میں اپنی استادی اور قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ سودا کے کلیات میں قائم کی کئی چیزیں اب تک شامل رہی ہیں، اور کلام کی کیفیت کے لحاظ سے سودا اور قائم کے اشعار کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنا اکثر جگہوں پر اس قدر دشوار ہے کہ اکثر تذکرہ نگار اور نقاد کلیاتِ سودا میں قائم کے اس الحاقی کلام کو سودا سے ہی منسوب کر کے ان کی داد دیتے آئے ہیں۔ ایسے شاعر کا کوئی کلیات آج تک مرتب ہو کر شائع نہیں ہوا تھا، یہ اردو والوں کی اپنے اساتذہ اور تہذیبی ورثے سے بے اعتنائی کا ایک واضح ثبوت ہے۔ تحقیق کی گرم بازاری نے سنگ ریزوں کو چن کر اونچے مقامات پر سجا دیا مگر جواہر ریزوں کی طرف کم ہی نگاہ گئی۔ تحقیق کے اس غلط اور بے سمت رجحان نے اب تک ہمارے یہاں تحقیق کو اُس سمت میں آگے نہیں بڑھایا کہ وہ تاریخِ ادب کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتی۔ قائم ہی کیا ایسے اور بھی اہم شعرا اور کتابیں ابھی اکثرت سے موجود ہیں جن کے صحیح اور مستند متن شائع نہیں ہو پائے۔ تحقیق کی عام کم توفیقی کو دیکھتے ہوئے دیوانِ قائم کی ترتیب و اشاعت اردو ادب و شاعری کی ایک ایسی خدمت ہے جس کے لیے اردو خواں طبقے کو ڈاکٹر خورشید الاسلام کا ممنون ہونا چاہیے۔

زیرِ نظر دیوان صرف غزلیات پر مشتمل ہے، جس کی بنیاد انڈیا آفس کے نسخے پر ہے، جو قائم کے تمام مخطوطوں میں سب سے زیادہ جامع اور مستند ہے۔ اس کا مقابلہ رامپور رضا لائبریری اور پروفیسر مسعود حسن رضوی کے مخطوطہ نسخوں کے علاوہ انتخاب دیوانِ قائم مرتبہ حسرت موہانی اور ریختہ دانشورا قائم مرتبہ عماد الملک بلگرامی سے بھی کیا گیا۔ اسی پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ مرتب نے تمام تذکروں کی چھان بین کی اور جہاں سے جتنے اشعار بھی ملے ان کی فہرست اور اختلافات و تصحیحوں کی شکل میں درج کر دیا۔ بظاہر ایڈیٹنگ آسان کام ہے لیکن اگر کوئی شخص پوری دیانت اور ذمہ داری سے کام کرنا چاہے تو یہ کام صبر آزما اور محنت طلب بھی ہے۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام نے اس کام میں نہ صرف باریک بینی تحقیق اور محنت کا ثبوت دیا ہے بلکہ خوش ذوقی اور باخبری کا بھی۔ کسی شاعر کے دیوان کو ایڈٹ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مرتب اس شاعر کے مزاج، اسلوب اور ساتھ ہی اس کے عہد کی زبان سے بھی کما حقہٗ واقفیت رکھتا ہو۔ وزن کا احساس اور ذوقِ شعر بھی اس کام میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ خورشید صاحب نے اس دیوان کی ترتیب میں اپنی تمام صلاحیتوں سے کام لیا ہے اور اسی لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دیوانِ قائم اردو میں ایڈیٹنگ کا ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے۔

اس دیوان میں قائم کی شاعری پر ایک بھرپور مقدمے کی کمی کھٹکتی ہے۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام محقق سے پہلے نقاد ہیں اور وہ قائم کے عہد، شاعری، شاعرانہ مزاج اور اردو شاعری میں ان کے کارنامے و مقام کے تعین پر لکھے اپنے تنقیدی مقدمے سے اردو کے اساتذہ اور طلبہ کی مدد کر سکتے ہیں، اُن سے ہماری یہ توقع بے جا نہیں کہ جب وہ کلیاتِ قائم کی دوسری جلد شائع کریں گے تو اس کے ساتھ قائم کے سلسلے میں اردو پڑھنے والوں کی اس ضرورت کی بھی خوبی تکمیل کریں گے۔

دیوانِ قائم اس حیثیت سے کہ یہ ہمارے ایک اہم شاعر کے دیوان کا پہلا مستند اور مکمل نسخہ ہے اردو کے ہر طالب علم کے لیے ایک علمی ضرورت کی تکمیل ہے، اور اس لحاظ سے کہ یہ ایڈیٹنگ کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے، محققین کے لیے ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان خوبیوں کے پیشِ نظر امید کی جا سکتی ہے کہ اردو سے محبت رکھنے والوں میں اس دیوان کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

صفحہ ۹ سے آگے

شاعری کی روایات پر ان کی نظر وسیع بھی ہے اور گہری بھی۔ اسی لیے ان کے یہاں کلاسیکی روایات کا احترام بھی ملتا ہے اور نئے موضوعات کے لیے انھیں برتنے کا سلیقہ بھی۔ کلاسیکیت، داخلیت، اور ذاتی غم کا بیان ان کی شاعری کے بنیادی عناصر ہیں لیکن ان کا تناسب حد سے زیادہ نہیں، یہ تینوں مل کر اسی حقیقت کا احاطہ کرتے ہیں جسے آج ہم سب جانتے، محسوس کرتے اور روزمرہ زندگی میں برتتے ہیں۔

نیا عہد نامہ میں نظم کا پلڑا ہلکا اور غزل کا پلڑا بھاری ہے لیکن ہم کسی شاعر سے نہ یہ مطالبہ کر سکتے ہیں اور نہ اس پر یہ پابندی لگا سکتے ہیں کہ اس نے یہ کیوں کہا، اور وہ کیوں نہیں کہا۔ مجموعی طور پر ان کی غزلوں میں بھی وہی فضا اور وہی عناصر ہیں جو نظموں میں ہیں۔ واردات کا اظہار جس فارم میں بھی ہو اسے سچا اور حقیقی اور شدید ہونا چاہیے۔ اس مجموعے کی نظمیں ہوں یا غزلیں شاعری کی اس بنیادی شرط کی تکمیل کرتی ہیں۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کی